Fikr-o-Nasar vol.1: 7-8 (1964)

تاریخ اسلام میں اہلِ حلّ وعقد کا تصوّر

محمّد خالد مسعود

اہل حل وعقد کے تصوّر نے بالکل ابتدائی سالوں میں ہی تاریخ اسلام کو پیش آنے والے بہت بڑے بحران سے بچا لیا۔ اسلامی نظریۂ حیات نے ابھی کسی منظم سماجی ادارے کی شکل اختیار نہیں کی تھی کہ حکومت کا ادارہ اچانک وجود میں آگیا۔ تحریکِ اسلام کا یہ نازک ترین مرحلہ تھا کیونکہ طاقت کے ایک دم ظہور سے یہ اندیشہ تھا کہ یہ کہیں ایسے دیو کی صورت نہ اختیار کرلے جس پر اس کے خالق کو بھی اختیار نہ رہے بلکہ وہ خود اپنے خالق پر تصرف کرے اور اپنے لئے آپ قانون وضع کرے۔ اگر یہ ابتدائی دور خلفائے راشدین کے مدبر ہاتھوں میں نہ ہوتا، جو جمہور امت کے اہل حل وعقد ہونے کے عقیدے کے قائل تھے (۱) تو عین ممکن تھا کہ یہ اندیشہ عملی صورت اختیار کرلیتا۔

نظریۂ حیات کی نشو ونما کے لئے ضروری ہے کہ قوت و اقتدار کو نظریۂ حیات کے تابع رکھا جائے۔ ابتدائی دور میں عملاً یہ صورت ناممکن نہیں تو مشکل ضرور نظر آتی تھی۔ کیونکہ اقتدار کو متوازن رکھنے کے لئے کوئی متوازی ادارہ موجود نہیں تھا۔ اگر اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آگیا ہوتا جو اسلامی نظریۂ حیات کی برتری کے قائل نہ ہوتے تو یہ صورت ناممکن ہی ہو جاتی۔ لیکن خلفائے راشدین [illegible] احتساب اور شوریٰ کی [illegible] محکم عقیدہ رکھتے تھے چنانچہ انھوں نے

©Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad.
http://iri.iiu.edu.pk/

دورِ نبوی کی حریت رائے کی روح کو زندہ رکھا اور شوریٰ کو اس قدر اہمیت دی کہ اس نے آہستہ آہستہ اجماع کے ادارے کی ایک ابتدائی شکل اختیار کر لی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ عقیدہ بھی مستحکم ہوتا گیا کہ اقتدار و حکومت شریعت کے تابع ہے۔

اقتدار کے شریعت کے تابع ہونے کے عقیدے سے اسلام کی عالمگیریت کا تصور زیادہ مضبوط ہوا کیونکہ قرآن و سنّت کی اساس پر قائم ہونے والی شریعت میں وہ لچک موجود تھی جو ہر قوم اور ہر زمانے کے لوگوں کی رہنمائی کر سکتی تھی۔ اسی سے وہ اعلیٰ اور ارفع وحدت قائم ہو سکتی تھی جو مختلف رسوم و رواج کے لوگوں کو یکجا کر سکے۔ وہ لچک دورِ نبوی کی پروردہ روحِ اجتہاد تھی۔ اسی کی ایک شکل شوریٰ تھی۔

ابتدائی دور میں شوریٰ کے عملی نفاذ سے ہی اقتدار کی اجارہ داری پر بندش ممکن ہو گئی۔ شوریٰ کا یہی تصور آخر میں اجماع کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اور انہی اہلِ اجماع کو بعد میں اہلِ حل و عقد کہا جانے لگا۔ ہم آئندہ سطور میں قدرے تفصیل سے اسی تصور کا تجزیہ پیش کریں گے۔

اس تصور نے اگرچہ کبھی واضح اور منظم ادارے کی شکل اختیار نہیں کی، لیکن یہ تصور اسلام کی سیاسی تاریخ میں بنیادی طور پر ہر جگہ موجود رہا ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اوائل میں اسے شوریٰ کا نام دیا گیا۔ تیسری خلافت کے انتخاب کے لئے شوریٰ کا ادارہ پہلی دفعہ واضح صورت میں قائم بھی ہوا لیکن اس کے بعد تاریخ میں ایسی منظم صورت میں نظر نہیں آتا۔ اس کے اسباب کیا تھے؟ اس سوال سے ہم ذرا آگے چل کر بحث کریں گے۔

شوریٰ نے کب چل کر "اہلِ حل وعقد" کی صورت اختیار کی؟ اور یہ اصطلاح کب مستعمل ہوئی؟ ہمیں سب سے پہلے اس سوال پر غور کرنا ہے۔ اس ادارے کے لئے اور بھی کئی نام استعمال ہوئے ہیں۔ جن کو تاریخی ارتقا سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ سیاسیّن نے اپنے نظریات کے اعتبار سے ان اصطلاحات کو استعمال کیا ہے۔ زیادہ مستعمل اور شناسا الفاظ ولاۃ الامر[۲]، اھل الشوریٰ[۳]، اھل الرائے[۴]، اھل الاجماع[۵] اور اھل الشوکۃ[۶] ہیں۔ لیکن متاخرین میں اہلِ حل وعقد کی اصطلاح اتنی مقبول ہو گئی کہ دوسرے الفاظ تقریباً متروک ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترکیب اتنی موزوں تھی کہ جونہی کسی نے پہلی بار استعمال کیا علما نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لیکن اسے سب سے

پہلے کس نے استعمال کیا؟ یہ طے کرنا ذرا مشکل ہے۔ بہر طور مطالعہ اور تحقیق سے ہم نے جو نتیجہ نکالا ہے اس کے لحاظ سے سب سے پہلے امام ابوالحسن علی اشعری (متوفی ۳۳۰ھ) کے ہاں اس کا استعمال ملتا ہے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ اسے اہل الشوریٰ کے بدل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کی عبارت مندرجہ ذیل ہے۔

وثبتت امامة علی بعد عثمان بعقد من عقد له من الصحابة من اهل الحل والعقد ولانه لم يدع احد من اهل الشوری غيره فی وقته۔

حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علی کی امامت صحابہ میں سے اہل حل وعقد حضرات کی بیعت سے ثابت ہوتی ہے اور اس لئے بھی کہ اہل شوریٰ نے حضرت علیؓ کے سوا کسی کو خلافت کے لئے دعوت نہیں دی۔[۷]

بعد میں یہ اصطلاح اشاعرہ میں اکثر مستعمل رہی۔ مثلاً ماوردی، جوینی اور اسفرائینی وغیرہ نے اسے کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ ان کا ذکر آئندہ سطور میں ہوگا۔

اجماع کی بحث میں فقہا کے لئے اہل الاجماع کا سوال سب سے اہم تھا۔ چنانچہ اصولیین اس ضمن میں بڑی تفصیلات میں جاتے ہیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے ہاں بھی اہل کلام کی طرح بتدریج اہل حل وعقد کی اصطلاح راہ پاتی ہے۔ سیف الدین آمدی (متوفی ۶۳۱ھ) اجماع سے بحث کرتے ہوئے اہل حل وعقد کے اتفاق کو شرط قرار دیتے ہیں[۸]۔ متاخرین اصولیین کے ہاں تو اجماع کی تعریف ہی ان الفاظ میں کی جانے لگتی ہے۔

الاجماع هو اتفاق اهل الحل والعقد من هذه الامة فی امر من الامور

اجماع سے مراد اس امت کے اصحاب حل وعقد کا کسی امر پر اتفاق ہے۔[۹]

قرآن میں "اولو الامر" انہی معنوں میں آیا ہے۔ تابعین کے دور میں عام طور پر اس سے محض اصحاب امر وحکومت مراد لئے جاتے تھے۔ لیکن اس دور میں بھی جابر بن عبداللہ، مجاہد، علی بن ابی طلحہ، عطا بن السائب اور الربیع عام انداز سے ہٹ کر "اہل علم وفقہ" مراد لیتے تھے[۱۰] بعد میں اس مفہوم کو اور وسعت ملی۔ اور مفسرین نے بتدریج اہل حل وعقد کی اصطلاح کو اپنا لیا۔ یہاں تک کہ فخر الدین رازی (متوفی ۶۰۶ھ) کے نزدیک اولی الامر اور اہل حل وعقد

مترادف ٹھہرے۔

قولہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم یقتضی وجوب طاعة جملة اهل الحل والعقد من الامة۔	آیت اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم یہ تقاضا کرتی ہے کہ امت کے تمام اہل حل وعقد اصحاب کی اطاعت واجب ہے[11]۔

اس اصطلاح کا پہلے پہل چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں مستعمل ہونا معنی خیز ہے۔ اگر اس وقت کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ عین منطقی معلوم ہوتا ہے۔

امام اشعری کی وفات ۳۳۰ھ میں متقی باللہ کے عہد میں ہوئی۔ ان دنوں اسلامی سلطنت سخت انتشار میں مبتلا تھی۔ خلافت اپنا وقار کھو چکی تھی۔ یہ انتشار خلیفہ متوکل (۲۴۷ھ) کی وفات سے شروع ہوا۔ اس کے بڑے بیٹے منتصر نے ترک فوجی جرنیلوں کی مدد سے اپنے باپ کو قتل کیا اور تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ اس کا وزیر فتح بن خاقان تھا۔ منتصر نے ۲۴۸ھ میں وفات پائی ترکو کے ہاتھوں میں اس کی حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا جانشین مستعین باللہ (۲۵۰ھ) تو مکمل طور پر ترکوں کے ہاتھوں میں کھیلنے لگا۔ چنانچہ سیوطی کہتا ہے۔

خليفة فی قفص بین وصیف وبغا یقول ماقالا له کما تقول الببغا	خلیفہ وصیف اور بغا، ترک فوجی افسروں کے ہاتھوں قفس میں ہے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں، بولتا ہے جیسے طوطی بولتا ہے[12]۔

[درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ہرچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم]

ترک جرنیلوں نے اسے بھی جلد معزول کر دیا اور اس کی جگہ معتز کو تخت خلافت پر بٹھایا خلفا میں سے کوئی بھی اس قدر کم سنی میں تخت پر نہیں بیٹھا[13]۔ خلیفہ کا ذاتی وقار اب بالکل ختم ہو چکا تھا ابن الطقطقی نے اس ضمن میں ایک بہت ہی دلچسپ لطیفہ نقل کیا ہے جس سے اس وقت کی حالت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

"معتز تخت پر بیٹھا، تو دربار کے امرا نے حسب دستور نجومیوں کو بلا بھیجا۔ ان سے پوچھا کہ خلیفہ کتنی عمر پائے گا؟ کوئی ظریف الطبع بھی دربار میں موجود تھا۔ اس نے کہا نجومیوں کی بجائے یہ سوال ترکوں سے دریافت کرنا چاہیے[14]۔"

یہ ترک اپنی خواہش سے خلفا کا عزل ونصب کرتے۔ مونس خادم، مقتدر کے عہد کا ایک ممتاز میر تھا۔ اس نے مقتدر کے خلاف بغاوت کی اور تخت پر قبضہ کر کے اسے معزول کر دیا۔ اور پھر ۳۲۰ھ میں اس نے بڑی بے رحمی سے مقتدر کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد قاہر باللہ (۳۲۰ - ۳۲۲ھ) جانشین ہوا۔ لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا اور مونس نے اسے بھی معزول کر دیا۔ عباسی سلطنت کا یہ دور انتہائی انتشار کا دور تھا۔ کئی خود مختار طاقتیں ابھر رہی تھیں، جس سے عباسی سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے خلیفہ راضی (۳۲۲ - ۳۲۹ھ) نے اس کی اصلاح کے لئے فوج کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دبانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس نے امیر الامرا کا ایک نیا عہدہ مقرر کیا۔ بصرہ کا گورنر ابن رائق پہلا امیر الامرا مقرر ہوا۔ جلد ہی اندرونی طور پر ابن رائق ایک آمر کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اور اس کی گرفت خلیفہ پر اتنی مضبوط ہو گئی کہ اس نے خلیفہ سے عملی طور پر تمام اختیارات چھین لئے۔

راضی کو ابن رائق کا یہ اقتدار بے حد ناگوار گذرا۔ اس نے اس کی جگہ ابن بجکم کو متعین کر دیا۔ تاکہ دونوں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہیں اور ابنِ رائق کی بڑھتی ہوئی گرفت کمزور پڑ سکے لیکن ابن رائق زیادہ طاقتور تھا۔ ان کے درمیان ۵ سال تک خونریز لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخر اس نے ابن بجکم کو بری طرح شکست دے کر قتل کر دیا اور خود سیاہ وسفید کا مالک ہو گیا۔

یہ ہے امام اشعری کے زمانے کا ایک سرسری جائزہ۔ یہ مطالعہ بتلاتا ہے کہ یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ ان حالات سے متاثر ہو کر لوگ امرا اور فوجی جرنیلوں کے متعلق سوچنے لگے ہوں کہ انھیں حل وعقد کے اختیارات حاصل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصطلاح انہی دنوں رائج ہوئی اور اس زمانے میں عوام میں اس کا استعمال بہت عام ہو چکا ہوگا۔ اس لفظ کے مفہوم میں ایک با اختیار قوت کا تصور موجود ہے۔ اسی لئے اس کا استعمال وہیں رونما ہوتا ہے جہاں فوجی طاقت برسرِ اقتدار ہو چنانچہ اشعری نے پہلے پہل ان الفاظ کو اسی سیاق میں استعمال کیا ہے۔ وہ خلفائے اربعہ کی امامت سے بحث کرتے ہوئے صرف حضرت علیؓ کی خلافت کے بارے میں اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں۔

فقد حصل الاجماع والاتفاق علی	ابو بکر صدیقؓ کی خلافت پر سب کا اجماع اور
امامة ابی بکر الصدیق واذا ثبتت امامة	اتفاق ہو گیا۔ جب صدیقؓ کی امامت ثابت ہو گئی
الصدیق ثبتت امامة الفاروق لان	تو فاروقؓ کی امامت بھی ثابت ہو جاتی ہے کیونکہ

الصديق نصّ عليه وعقد له الامامة فاختاره لها وكان افضلهم بعد ابي بكر وثبتت امامة عثمان بعد عمر بعقد من عقد له الامامة من اصحاب الشوري الذين نصّ عليهم عمر فاختاروه ورضوا بامامته وثبتت امامة علي بعد عثمان بعقد من عقد له من الصحابة من اهل الحل والعقد ولانه لم يدع احد من اهل الشوري غيره في وقته -

حضرت صدیقؓ نے اس کی تنصیص فرمائی تھی اور فاروقؓ کو نامزد کیا تھا اور یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد وہی افضل الصحابہ تھے۔ پھر حضرت عثمانؓ کی امامت اصحاب شوریٰ کے عقد سے ثابت ہوئی جن کو حضرت عمرؓ نے نامزد کیا تھا۔ انھوں نے آپ کا انتخاب کیا اور آپ کی امامت پر رضامند ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کی بیعت صحابہ میں سے اہل حل وعقد حضرات کے عقد سے ثابت ہوئی کیونکہ انھوں نے اس زمانے میں حضرت علیؓ کے سوا کسی کو خلافت کی دعوت نہیں دی[15]

تاریخی جائزہ

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ہے یہ ادارہ پہلے پہل حضرت عمرؓ نے تیسری خلافت کے انتخاب کے لئے قائم کیا۔ اسے مجلس شوریٰ کا نام دیا گیا۔ پہلے دو خلفا کا انتخاب اس مجلس کے ذریعہ نہیں ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب سقیفہ بنی ساعدہ میں عمل میں آیا اور حضرت عمرؓ نامزد ہوئے۔ ان دو خلفا کا انتخاب کرنے والے لوگ مدینہ کے ممتاز مہاجر اور انصار تھے۔ لیکن انتخاب کا باقاعدہ ادارہ پہلے پہل حضرت عمرؓ ہی نے تجویز کیا۔

حضرت علیؓ کا انتخاب انتہائی نازک حالات میں ہوا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد لوگ حضرت علیؓ کے پاس خلافت کی پیش کش لے کر آئے۔ حضرت علیؓ نے ان کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ ان میں اصحاب شوریٰ شامل نہیں تھے۔ ابن قتیبہ اس واقعہ کی پوری تفصیل دیتے ہیں اور حضرت علیؓ کی یہ گفتگو نقل کرتے ہیں۔

فاتوا عليا في داره - فقالوا

لوگ حضرت علیؓ کے گھر آئے اور کہا

نبايعك فمد يدك، لابد من امير فانت احق بها. فقال: ليس ذلك اليكم، انما هو لاهل الشورى واهل بدر فمن رضى به اهل الشورى واهل بدر فهو خليفة۔

ہم آپ کی بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ ہاتھ بڑھایئے ایک نہ ایک امیر ہونا ضروری ہے۔ اور آپ سب سے زیادہ اہل ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ یہ تمہارا کام نہیں۔ یہ کام اہل شوریٰ اور اہل بدر کا ہے جس کی خلافت پر یہ لوگ رضامند ہو جائیں وہی خلیفہ ہوگا۔[16]

دوسرے مورخین نے بھی اس واقعہ کو اسی طرح بیان کیا ہے۔ طبری نے بھی حضرت علیؓ کی بیعتِ خلافت کی تفصیل درج کی ہے۔ اس کے نزدیک مہاجرین اور انصار اہل انتخاب تھے۔ جنھوں نے سب سے پہلے بیعت کی اور ان کے حلف کے بعد عام لوگ بیعت کے لیے آئے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

فلما دخل المهاجرون والانصار فبايعوه، ثم بايعه الناس۔

جب مہاجرین اور انصار بیعت میں داخل ہو چکے تب عام لوگوں نے بیعت کی۔[17]

یہ شوریٰ کا دور تھا جب اقتدار اموی خاندان میں منتقل ہوا حل وعقد کے اختیارات بھی اموی خاندان کے سربرآوردہ لوگوں کے ہاتھ میں آگئے۔ اسی دوران میں یزید کی تخت نشینی کا سوال اٹھا۔ اگرچہ اموی برسر اقتدار تھے لیکن شوریٰ کا تصور، خواہ وہ موہوم سا ہی کیوں نہ ہو، ابھی موجود تھا۔ اور مدینہ کے لوگوں کی بیعت لازمی سمجھی جاتی تھی۔ حضرت معاویہ اور یزید نے اہلِ مدینہ کی رضامندی حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن حضرت حسینؓ اور ابن زبیر برابر مخالف رہے۔ کربلا کے حادثہ نے اہل مدینہ کی اس رہی سہی طاقت کا تصور بھی ختم کر دیا۔ اور حل وعقد کے اختیارات مکمل طور پر امویوں کے ہاتھ میں آگئے۔ مروان کا انتخاب قبیلۂ کلب کی طویل جدوجہد کے بعد عمل میں آیا۔ لیکن اس کے بعد ولی عہد کی نامزدگی اور موروثی خلافت کے رواج نے یہ اختیار عملی طور پر امرائے سلطنت سے چھین لیا تھا۔ تاہم ملکی امور میں انھیں کافی دخل تھا اور بعض اوقات وہ خلیفہ کو اس کی رائے بدلنے پر مجبور بھی کر سکتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی نامزدگی اسی طرح عمل میں آئی۔ سلیمان بن عبد الملک کو رجاء بن حیوٰۃ شامی کندی نے مجبور کیا کہ وہ اپنے بیٹے کی بجائے عمر بن عبد العزیزؒ کو نامزد کرے۔[18] ۷۵۰ء تک

قبیلہ بنوکلب کا عمل دخل رہا۔ بنوامیہ کے آخری خلیفہ مروان نے کوشش کی کہ یہ اختیارات نضری قبیلہ میں منتقل ہو جائیں۔ لیکن یہ زوال کے ایام تھے اور وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ دریں اثنا عبّاسی بنوامیہ کی خلافت ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اب یہ اختیارات خاندان عباسی میں منتقل ہو گئے۔ لیکن حقیقتاً سیاسی اصولوں کے لئے خلافت ایرانی عنصر کی مرہون منت تھی۔ کیونکہ انہی کی مدد سے عباسی برسر اقتدار آئے تھے۔ منصور نے مکہ میں خطبہ دیتے وقت کہا:۔

ایھا الناس۔ انما انا سلطان اللہ فی ارضہ، اسوسکم بتوفیقہ، وتسدیدہ وتائیدہ وحارسہ علی مالہ، اعمل فیہ بمشیتہ وارادتہ واعطیہ باذنہ، فقد جعلنی اللہ علیہ قفلا۔

اے لوگو میں اللہ کی زمین پر اس کا سلطان ہوں۔ اس کی توفیق، تفویض اور تائید سے تم پر حکومت کرتا ہوں میں اس کے مال پر اس کی طرف سے نگران ہوں۔ اس کی مشیت اور ارادے کے مطابق عمل کرتا ہوں اس کی اجازت سے ہی عطایا دیتا ہوں۔ کیونکہ اللہ نے اپنے خزانے پر مجھے قفل بنا کر بھیجا ہے۔[۱۹]

اس خطبے سے معلوم ہوتا ہے کہ عباسی خلافت میں خود نظریۂ خلافت میں تبدیلی آ گئی تھی۔ ایرانی لوگ بادشاہت کے آسمانی ہونے کے قائل تھے اور بادشاہ کے حقوق آسمانی کا عقیدہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اس طرح خلیفہ کے انتخاب اور امت کے سامنے جواب دہ ہونے کا تصور ختم ہو گیا۔ اگرچہ بیعت اب بھی قائم تھی لیکن اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ اس کے ذریعے نئے خلیفہ کی اطاعت کا اعلان کیا جائے۔ اس دور میں دو بیعتوں کا رواج ہو گیا تھا۔ ایک بیعت عامہ اور ایک بیعت خاصہ۔ بیعت خاصہ میں فوجی سپہ سالار، امرا اور قضاۃ شامل ہوتے تھے اور بیعت عامہ میں عوام ہوتے تھے۔ بیعت عامہ علاقے کے والی یا قاضی کے ہاتھ پر کی جاتی تھی۔ ان لوگوں کو عملاً امور سلطنت میں کوئی دخل نہیں تھا۔ ۲۳۲ھ میں متوکل کے دور میں ترکوں کا غلبہ ہوا اور ۳۳۰ھ تک حل وعقد کے اختیارات صحیح معنوں میں انہی ترک امرا کے ہاتھوں میں رہے۔ مفوض، ابوالعباس بن موفق، مقتدر، ابن معتز اور قاہر باللہ انہی فوجی جرنیلوں کے ہاتھوں تخت نشیں اور معزول ہوتے رہے۔ اس کے بعد

بویہہ برسر اقتدار آئے۔ انھوں نے خلیفہ کے اختیارات مکمل طور پر چھین لئے۔ غزالی کے الفاظ میں

"ان دنوں حکومت کا یہ حال ہے کہ یہ کلی طور پر فوجی حکومت بن کر رہ گئی ہے۔ جس کسی کو یہ فوجی جرنیل خلافت کے لئے نامزد کر دیں وہی خلیفہ ہو جاتا ہے۔"[۲۰]

اس تاریخی جائزے سے ہم بڑی آسانی سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اموی دور میں قبائلی اور عصبی قوت حل وعقد کے اختیارات استعمال کر رہی تھی اور عباسی دور کے اواخر میں یہ پورے طور پر فوجی جرنیلوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ علما اور قضاۃ کو فوجی جرنیلوں کا سا قوت و اختیار حاصل نہیں تھا۔ تاہم ان کو سلطنت کے زعماء میں شمار کیا جاتا تھا اور بیعت خاصہ میں شامل رکھے جاتے تھے۔ قانونی اور فقہی امور میں ان کی رائے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اگرچہ کبھی ان سے اجماعی فتویٰ نہیں لیا گیا۔ بلکہ اکثر ان کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ امور سلطنت میں اپنی رضامندی کا اظہار کر دیں۔ یہ بظاہر کچھ ناروا سا معلوم ہوتا ہے لیکن بہر طور اس سے اس حقیقت کی غمازی ضرور ہوتی ہے کہ ان کو بھی اہل حل وعقد کا جزو لاینفک سمجھا جاتا تھا۔

(۲)

مندرجہ بالا تاریخی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ اہل حل وعقد کسی متعین گروہ یا مجلس کا نام نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس اصطلاح کا اطلاق ان تمام ارباب اختیار پر ہوتا رہا ہے جنھیں حل وعقد کے اختیارات حاصل تھے (فارسی میں "ارباب بست وکشاد" اس سے بڑی دلچسپ لغوی اور معنوی مشابہت رکھتا ہے)، قرآن مترادف معنی میں اولی الامر کا لفظ استعمال کرتا ہے اور ان کی اطاعت واجب قرار دیتا ہے۔[۲۱]

اولین دور کے مفسرین نے اولی الامر کی تفسیر میں عموماً امراء اور عمال کو شامل کیا ہے اگرچہ بعض نے اس کا اطلاق محض سرایا کے امیروں پر کیا ہے[۲۲]۔ بعض نے اس سے خلفائے راشدین[۲۳] اور بعض نے ائمہ معصومین[۲۴] مراد لیا ہے۔ امام اشعری جنھوں نے واضح طور پر اہل حل وعقد کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس سے اہل علم ومعرفت مراد لیتے ہیں[۲۵]۔ رازی[۲۶]۔ شہاب الدین مالکی[۲۷]۔ نسفی اور جمہور اصولیین کے ہاں اس سے علماء اور اہل اجتہاد مراد ہیں[۲۸]۔ سعد الدین تفتازانی نے اس کے مفہوم میں علماء کے ساتھ ساتھ سرکردہ ارباب ملت کو بھی شامل کیا ہے[۲۹]۔ شاہ ولی اللہ ان میں فوجی امراء کو بھی شامل کرتے ہیں[۳۰]۔

اصولیین کے ہاں اس کی تعبیر میں اختلاف کی بڑی وجہ سیاسی صورت حال رہی ہے چنانچہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت اصولیین ان کے وظیفے کے تعین میں اختلاف کرتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے دائرۂ اطلاق کو وسیع یا تنگ کرتے رہے ہیں۔ جن اصولیوں نے محض تشریع اور قانون سازی تک حل وعقد کے دائرۂ عمل کو محدود دیکھا انھوں نے مجتہدین اور علما کو اہل حل وعقد قرار دیا جنھوں نے ذرا وسعت دے کر قضا اور عدل کو بھی اس مفہوم میں شامل کیا انھوں نے قضاۃ اور شرطہ کو بھی اہل حل وعقد کے دائرے میں لے لیا۔ دراصل ان دنوں نظام حکومت نہ آج کی طرح پیچیدہ تھا کہ اختیارات کی تقسیم اور تحدید کا مسئلہ زیر غور آتا۔ نہ آج کی طرح منظم تھا کہ ان اداروں کا تعین ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے تینوں بڑے شعبے عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ اس کے تحت لئے جا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصولیین کے ہاں اس بارے میں اختلاف ہے۔ عام طور پر اہل حل وعقد سے بحث کرتے ہوئے وہ ان کے دو فریضے بیان کرتے ہیں۔

۱۔ انتخاب خلافت:

فقہا کے نزدیک یہ سب سے اہم فریضہ رہا ہے۔ اگرچہ عملاً ان کی حیثیت صرف بیعت کرنے والوں کی تھی لیکن فقہا نے انھیں انتخاب کنندگان میں شمار کیا ہے۔ اسی لئے ان کے نزدیک امامت کے انعقاد کے لئے اہل حل وعقد کی رضامندی لازمی ہے۔ ماوردی کہتے ہیں۔

وانعقدت بیعتھم لہ الامامۃ۔ فلزم کافۃ الامۃ الدخول فی بیعتہ والانقیاد لطاعتہ۔	ان (اہل حل وعقد) کی بیعت سے اس (مبایع) کی امامت منعقد ہو گئی۔ چنانچہ تمام پر اس کی بیعت کرنا اور اس کی اطاعت کرنا واجب ہو جاتا ہے[۳۱]

چنانچہ جب اہل حل وعقد کسی کی خلافت پر متفق ہو جائیں تو امت پر ان کی اطاعت واجب ہے۔ اس سے دور جدید کے مفکرین کو بھی اتفاق ہے۔ رشید رضا لکھتے ہیں۔

فھؤلاء (ای جماعۃ اھل الحل والعقد) اذا اتفقوا علی امر او حکم وجب ان یطاعوا فیہ۔	پس یہ لوگ (اہل حل وعقد) اگر کسی امر پر متفق ہو جائیں تو ان کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے[۳۲]۔

فقہانے یہاں ایک اور دلچسپ سوال پیدا کیا ہے کہ اگر اہل حل وعقد کسی کی امامت پر اتفاق کرلیں، لیکن وہ شخص رضامند نہ ہو تو کیا صورت ہوگی۔ ماوردی اور جمہور فقہا کے نزدیک اگر وہ شخص انکار کررہا ہو تو اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا[۳۳]۔ لیکن تمام فقہا کو اس سے اتفاق نہیں[۳۴]۔

اس ضمن میں دوسرا سوال یہ ہے کہ اہل حل وعقد میں سے کم ازکم کتنے افراد کا اتفاق ضروری ہے اس سلسلے میں فقہا سے حیران کن حد تک مختلف اقوال منقول ہیں۔ ان کی تعداد ایک سے لے کر چھ تک بیان کی جاتی ہے۔ ماوردی نے فقہا کے اس اختلاف سے بحث کے لئے الگ باب باندھا ہے۔ فقہائے اہل سنت عموماً اہل حل وعقد میں سے صرف ایک کی رائے کو امامت کے انعقاد کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اشعری[۳۵]، ماوردی[۳۶]، ابن ہمام[۳۷]، غزالی[۳۸] اور قاضی عضدالدین[۳۹] سب اسی اصول کی حمایت کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کا انعقاد صرف ایک شخص حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے ہوا تھا۔

اس ضمن میں ماوردی نے ایک گروہ کی یہ دلیل بھی نقل کی ہے کہ حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ سے کہا تھا کہ اپنا ہاتھ بڑھایئے میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔ تاکہ لوگ کہیں کہ نبیؐ کے چچا نے نبیؐ کے چچا زاد کی بیعت کرلی ہے۔ اور اس پر کوئی جھگڑا نہ ہو۔ یہاں تک کہ دو آدمی بھی اس سے اختلاف نہ کریں۔ اس سے نتیجہ نکالتے ہوئے ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اس طرح حضرت عباسؓ اکیلے حضرت علیؓ کی خلافت کی تجویز کرنے والے تھے۔ لہذا صرف ایک شخص کی نامزدگی بھی قانونی حیثیت رکھتی ہے[۴۰]۔

کوفیوں کا تو عموماً یہی عقیدہ رہا کہ خلافت کے لئے اہل حل وعقد میں سے صرف ایک شخص کی نامزدگی کافی ہے۔ لیکن دوسرے فقہا عام طور پر اکثریت کے اتفاق کے قائل رہے۔ بلکہ ابوبکر الاصم (۲۴۶ھ) مشہور معتزلی کا عقیدہ تھا کہ امامت کے انعقاد کے لئے جمہور امت مسلمہ کا اتفاق ضروری ہے تاہم کم ازکم تعداد جس پر بالعموم اتفاق رہا، پانچ ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں ابوبکرؓ کی پہلی بیعت میں پانچ صحابہ شامل تھے۔ حضرت عثمانؓ کے انتخاب کرنے والوں کی تعداد بھی یہی ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک خلافت کے انتخاب کے لئے کم ازکم پانچ کا اتفاق ضروری ہے۔

ب۔ تشریع۔

یہ اس مجلس کا بنیادی وظیفہ ہے۔ مسلم معاشرہ کے نشو و ارتقا کے لئے پیش آمدہ مسائل کا

حل تلاش کرنا ضروری تھا۔ فقہانے اہل حل وعقد سے مراد ہی مجتہدین لئے ہیں چنانچہ شہاب الدین مالکی اجماع کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں :

الاجماع هو اتفاق اهل الحل والعقد من هذه الامة فی امر من الامور ونعنی باهل الحل والعقد المجتهدين فی الاحكام الشرعيه۔	اجماع سے مراد امت کے اصحاب حل وعقد کا کسی امر پر اتفاق ہے اور اہل حل وعقد سے ہماری مراد شرعی احکام میں اجتہاد کے اہل لوگ ہیں[41]۔

امام رازی کے نزدیک علما کو اسی لئے اہل حل وعقد میں شمار کیا گیا ہے کہ وہ قانون سازی میں حصہ لیتے ہیں۔

ان الاجماع لا ينعقد الا بقول العلماء الذين يمكنهم استنباط احكام الله من نصوص الكتاب والسنة، وهؤلاء هم المسمون باهل الحل والعقد۔	اجماع حقیقتاً ان علما کے قول کے بغیر منعقد نہیں ہوسکتا، جنھیں کتاب وسنت کی نصوص سے احکام الٰہی کے استنباط کی قدرت ہو اور انہی (علما) کو اہل حل وعقد کا نام دیا گیا ہے[42]۔

اس بارے میں سب سے اہم مسئلہ جو سب سے زیادہ نظرانداز رہا ہے اس ادارے کی تشکیل کا مسئلہ ہے اصولیین کے ہاں جو انتشار اور اختلاف ہے اس کی بڑی وجہ بھی یہی الجھن ہے۔ اور اسی کی وجہ سے خود یہ تصور بے حد مبہم ہوگیا ہے۔ دستوری قانون کی تشکیل میں انھوں نے ہمیشہ تاریخ کی تعبیر سے کام لیا۔ جیسا کہ موضوع زیر بحث سے واضح ہوچکا ہے۔

ایک لحاظ سے یہ بہت ہی مناسب طریق کار تھا کہ بدلتے ہوئے حالات کے لئے قانون میں لچک رکھی جائے۔ یہ بات خود ان بیدار مغز فقہا کی خواہشوں کے برعکس ہوگی کہ ہم آئندہ کے لئے اس طرز فکر کو ختم کردیں اور ایک قسم کی رجعت پرستی کو اپنالیں جس سے ہم وقت کے ایک مختصر سے وقفے میں محدود ہوکر رہ جائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس تصور میں ایسی مبادیات موجود ہیں جو ہمارے سیاسی نظام کی اساس بن سکتی ہیں۔ اس کی جزئیات میں جہاں خلا نظر آتا ہے اسے ہم جدید وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پُر کرکے قابل عمل بنا سکتے ہیں۔